تجربات اور جیسی چیکیاں جڑی تھیں ان کی کشش لڑکیوں کو بلا تکلف خالہ کے قریب لے آتی۔

اس کے علاوہ خالہ نے اپنے ہاں جیسے شادی کا ایک بیورو کھول رکھا تھا۔ جوان لڑکے خالہ کے در پر جبیں رگڑتے۔ محبت کا دم بھرتے۔ خالہ کے ہاتھ پیروں، اور بالوں کی تعریف کرتے اور اپنی سہ پارہ تک پہنچتے۔

یہ ساری کارروائی بہت معصوم تھی۔ اس میں نہ تو شعوری جدوجہد تھی نہ ہی شعوری لذت آفرینی۔ صرف اتنی بات ضرور تھی کہ خالہ نے اپنے گرد اتنے سارے چاند اکٹھے کر لئے تھے کہ ان ہی خوشنما عورتوں کے جلو میں خالہ فیروزہ بہت نظر فریب معلوم ہوتی تھیں۔

جب پہلے پہل رشّو لاہور آئی تو خالہ کو یہ معصوم الھڑ سی لڑکی بہت پسند آئی۔۔۔ خالہ کا خیال تھا کہ اگر روسن چپل پہن کر اور بیک لیس بلاؤز زیب تن کر کے یہ ان کے ساتھ کسی پارٹی میں گئی تو کافی تہلکہ بپا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خالہ نے پہلی کوشش کی لیکن وار اوچھا پڑا۔ اگر پنگ پانگ کے بال کو زمین پر مارو تو وہ تلملا کر اوپر کو اٹھتا ہے لیکن اگر ربڑ کا ٹھس گیند اسی شدومد کے ساتھ زمین پر مارا جائے تو اچھلنے کے بجائے پھسلتا لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ کسی شادی پر جانا تھا۔ سب تیار ہو چکے تھے۔ خالہ فیروزہ نے اپنی ایک پسندیدہ ساڑھی اور کھلے گلے کا بلاؤز لے کر رشیدہ کے کمرے میں آئیں۔

رشّو نے ساڑھی بھی پہن لی، پاؤں میں روسن چپل بھی اڑس لی۔ لیکن جب بلاؤز پہن کر وہ غسلخانے میں گئی اور آئینے میں ہنسلی کی ہڈیاں صاف نظر آئیں تو اسے ٹھنڈا

پسینہ آگیا۔ یہ نظارہ نظر فریب بھی تھا اور گناہ آلود بھی۔ ابھی سمان پر چوطے و پرجی نہ ہوئی تھی کہ اس نے جلدی سے یہ کپڑے بدل لئے اور سیدھی سادی شلوار قمیض پہن کر خالہ فیروزہ کے کمرے میں پہنچی۔ تنویر اور خالہ پوری آب وتاب سے پریزاد بنی کھڑی تھیں۔

"تم چلو تنویر میں ابھی آئی۔"

تنویر ہیل کی سارھی پھڑکاتی باہر چلی گئی تو خالہ بولیں۔

"دیکھو رشو! یہ لاہور ہے اور لاہور کی سوسائٹی کے کچھ تقاضے ہیں۔ میں نہیں ہرگز اپنی پوور ریلیشن بنا کرلے جانا نہیں چاہتی۔"

"جی خالہ . . ."

"عورت نمائش کی چیز ہے۔ جب تک اس کا نمائشی پہلو زندہ رہتا ہے۔ وہ زندہ رہتی ہے۔ اگر تم جوانی میں اس قدر اس سے بے نیاز ہو تو ہماری عمر کو پہنچ کر کیا بنے گا؟"

گو اپنے نزدیک ان کی عمر ابھی تشویشناک نہ تھی۔

"جی خالہ . . ؟"

"عورت کے متعلق مشہور ہے کہ پندرہ بیس کے درمیان عورت براعظم افریقہ کی مانند ہے، پراسرار، اور نادریافت۔ بیس اور پچیس کے درمیان عورت برِّاعظم ایشیا کی طرح گرم مرطوب اور اپنی ہی آگ میں جلتی ہے۔ پچیس اور تیس کا وقفہ امریکہ کی مانند ہے کہ ہر سیاح ادھر جاتا ہے اور اسی کے گن گاتا ہے۔ چالیس کو پہنچتے پہنچتے اس کی حالت یورپ کی سی ہو جاتی ہے۔ پامال اور خستہ حال۔ ہر ایک کا نقش قدم سینے پر لئے ہوئے

اور جانتی ہو کہ چالیس کے بعد عورت کس براعظم سے مشابہت رکھتی ہے؟"

"نہیں خالہ۔"

"آسٹریلیا سے . . . سبھی جانتے ہیں کہ وہ خط استوا سے نیچے ہے لیکن کوئی بھی ادھر کا رُخ نہیں کرتا۔"

رشّو کے کان اُبلتی کیتلی کی طرح سوں سوں کرنے لگے۔

"جو ساڑھی میں نے دی تھی وہی پہنو . . . ہاں . . ."

رشّو خالہ کا حکم بجا لانے لگی اور خالہ رشّو جان کو اس سکھ کا لطیفہ سنانے لگیں جو اپنی نویلی سردارنی کے ساتھ پہلی بار ٹرین میں سوار ہوا۔ جب خالہ اس مقام پر پہنچیں جب سردار جی نے ساتھی مسافر کو بورڈ دکھا کر کہا تھا کہ چلتی گاڑی میں اوپر چڑھنا منع ہے تو خالہ خود ہی بہت محظوظ ہوئیں۔ لیکن رشّو جان خالہ کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

اس احمق کو ساتھ لے جا کر خالہ کا جی اور بھی گھبرا۔ وہاں تو ہر جگہ خالہ کی مانگ تھی۔ خالہ سلام، آپا سلام کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اور رشّو جان چھچھوندر کی طرح سمٹی جا رہی تھی۔ دیواروں سے لگ لگ کر کھڑی ہو جاتی۔ گھر کے نوجوان لڑکے کھانے کے طشت لا رہے تھے۔ سب کا پھیرا خالہ کی طرف ضرور ہوتا۔

"خالہ! یہ مرغ کی ٹانگ لیجیے۔"

"آپا! یہ گرم زردہ ہے۔"

"فرنی تو آپ نے کھائی نہیں۔"

"لیجئے یہ بریانی کا طشت . . . . خاص آپ کے لئے ."

خالہ مہ پاروں کے حلقے میں گلابی لیس کی ساڑھی پہنے ہر نوجوان سے مذاق کر رہی تھیں جنسی لطیفوں پر قہقہوں کے پرنالے چھوٹ رہے تھے . نوجوان لڑکے خالہ کی کا طواف لگا رہے تھے . سرگوشیوں میں خالہ کی تعریف ہو رہی تھی . اور لم کنی رشیدہ ر پر ساڑھی کا پلو لئے ایکٹریس سونیا کی طرح بے وقت کی راگنی بنی بیٹھی تھی .

خالہ کے پاس نم مٹی کے لئے تو بیج تھا لیکن ایسی بنجر زمین میں زعفران کا پودا اگانے کے لئے ان کے پاس وقت نہ تھا . چھوڑا اور بالکل چھوڑ دیا . بلکہ ایک طرح سے انہیں اس نیک پروین صورت لڑکی سے وحشت بھی ہونے لگی . انہیں یوں احساس ہونے لگا جیسے وہ جان بوجھ کر لاجونتی بن کر انہیں چڑاتی ہے . اسے دیکھ کر خالہ کو خیال پیدا ہوتا جیسے یہ ڈھکر سلے باز سب کچھ محض دکھانے کو کرتی ہے . اس کا نیک نفسی سے کوئی تعلق نہیں . اصل سے کوئی علاقہ نہیں .

کالج کے ہوسٹل میں غازی کے کمرے میں ہر چوتھے دن وہی مثل کھلتی . وہی مقدمہ چل نکلتا . غازی نے گتے پر اے بی سی ڈی لکھتے ہوئے پوچھا .

"تو ان دنوں تیرے بہاولپور کا کیا حال ہے ؟"

ظفر خاموش رہا .

"کسی خط کا جواب بھی اس نے دیا ہے کہ نہیں ؟"

ظفر نے کوئی جواب نہ دیا .

"جواب وہ نہیں دیتی اور بول چال تو نے ہم سے بند کر دی ہے۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا۔۔۔۔"

"دیا ہے جواب اس نے۔"

"لے مار لیا میدان میرے یار۔۔۔۔ مبارک۔۔۔ مبارک!"

اور ساتھ ہی کانوں پر ہاتھ رکھ کر افتخار نزاکت علی کے انداز پر گانے لگا۔

"شبھ گھڑی، شبھ لگن صورت۔ حجرت اکبر آیو۔"

"بس خدا کے لئے۔۔۔ بس خاموش ہو جاؤ۔ یہ تو پوچھ لینے دو کہ لکھتی کیا ہے" غازی نے کہا۔

"لکھتی ہے۔

"آپ مجھے یوں خط نہ لکھا کریں۔ اگر آپ کو میری رسوائی کا پاس نہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کی بربادی کا باعث ضرور بن سکتی ہوں۔

فقط دعاگو

رشیدہ"

"یعنی سارا خط حفظ ہے میاں کو۔۔۔ واہ وا۔۔ سبحان اللہ۔ کاش سائیکولوجی کبھی اسطرح یاد ہو جایا کرتی تمہیں۔۔!" افتخار نے کہا

"پھر؟" غازی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پھر کچھ نہیں۔"

"پھر بھی . . . ." غازی نے میز پر انگریزی ابجد والا گتہ رکھا۔ اس پر ایک چوکور شیشہ رکھا۔ اور گلاس کو قمیص کے دامن سے صاف کرنے لگا۔

"کچھ نہیں۔ وہ اپنی وضع شوق سے نہ بدلیں۔ ہمارے جذبات کو ان کے رویے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ہیر ہیر . . . ." اوپر فضا میں ہاتھ اٹھا کر افتخار بولا۔ "تمہارے گلینڈز خراب ہیں ایڈرنل کی کمی ہے۔ آیوڈین کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔ اگر یہ غدود ٹھیک درست کام نہ کریں تو تین صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ یا تو انسان بے تحاشا موٹا ہونے لگتا ہے۔ بالکل ہاتھیوں کی مانند . . . . ایسی بیماری کو ڈاکٹر ایلیفنٹس کہتے ہیں۔ دوسری حالت میں عشق ہو جاتا ہے۔ تیسری صورت خودکشی کی ہو سکتی ہے۔"

ظفر نے یکدم اٹھتے ہوئے کہا۔

"لیجیئے صاحب . . . . رخصت۔"

"کہاں۔ کہاں کہاں کہاں! میں تو روحیں بلانے لگا ہوں۔"

"بلایئے بلایئے۔ بسم اللہ۔ ہم تو چلے۔"

گو ظفر کے اپنے دل میں کئی سوال چھپن اٹھائے کھڑے تھے لیکن اس وقت اس کے پاس افتخار کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

"آؤ، بیٹھو یہاں۔ آج ہمارا تیسرا ساتھی نہیں ہے۔ آؤ۔ انگلی رکھو گلاس پر۔"

ظفر نے پہلے تو منہ بنایا اور پھر آہستہ سے بیٹھ کر گلاس پر انگلی رکھ دی۔ بتی بجھا

ی گئی۔ دو موم بتیاں روشن کر کے میز کے کناروں پر اس طرح رکھی گئیں کہ روشنی تو پورے طور پر آتے، اور حروف پڑھے جا سکیں لیکن گلاس کی چلت پھرت اور باہنوں کو آگے پیچھے کرنے میں کوئی دقت درپیش نہ ہو۔

غازی نے کہنا شروع کیا۔

"کوئی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہو۔۔۔ ازراہِ کرم اس گلاس میں آئے اور اپنی آمد کا پتہ گلاس کو لفظ لیں تک لے جا کر واضح کرے۔"

فضا خاموش تھی۔ اندھیرا باہر گہرا ہو چکا تھا۔

گلاس ہولے ہولے لیں کی طرف بڑھنے لگا۔

"پیاری روح! یہ بتاؤ کیا واقعی ظفر کو رشیدہ سے محبت ہے؟"

"شٹ اپ!"

گلاس نے کئی بار نو کی طرف اشارہ کیا۔

پہلے ازراہِ مذاق سوال کئے گئے پھر سنجیدہ باتوں کی طرف توجہ کی گئی، اور آہستہ آہستہ وہ مجذوبوں کی طرح سر جوڑے کچھ خوف زدہ کچھ سحر زدہ چپ چپ گھومتے گلاس کی طرف دیکھنے لگے۔

ظفر کو اپنا پہلا عشق یاد آنے لگا۔ اس میں یہ کیفیت تو نہ تھی لیکن اس میں شدت کہیں زیادہ تھی۔ جیسے کسی دوائی کا ڈھکنا کھولتے ہی الکوحل کی بو دماغ کو چڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ عشق یکبارگی بلاوجہ ہلہلا کر سارے وجود کو چڑھ گیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ گھر کا سارا کام ابھی کرنا باقی تھا اور کل بیس چھٹیاں رہ گئی تھیں جب ظفر کو ٹائیفائڈ بخار ہو گیا۔ ان دنوں تپ محرقہ کا یہ علاج نہ تھا جو ان دنوں کلوروما ئسین کی وجہ سے ممکن ہو گیا ہے۔ مریض کو فاقے مار دیتے تھے۔ اناج کا ایک دانہ نہیں۔ بوٹی شوربے تو درکنار دلیہ تک کھانے کو نہ دیا جاتا۔ یعنی ہر طرح کی غذا منع تھی۔ بس یا تو دودھ پینے کو ملتا یا دن میں ایک بار ایک چمچ ساگودانہ۔ آناں اس پر سارا دن پہرا دیتیں کہ کہیں وہ کسی سے کچھ مانگ کر کھا نہ لے۔

ایک دن یہ پہرے دار بدل گیا اور آناں کی جگہ ایک دراز قد لڑکی اندر آئی جس کی ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ تو نے جیسے سرین اور بڑا چوڑا دہن تھا۔ اللہ جانے وہ لڑکی تھی کہ عورت . . . لیکن ظفر کو اس سے بے حد خوف آیا۔ کبھی دل میں سوچتا شاید بچوں کی ماں ہے۔ کبھی خیال آتا کہ نویں میں پڑھتی ہو گی اور رنھٹی ہے میری طرح۔

"رسالہ چھوڑ دو . . . اور لیٹ جاؤ خاموشی سے"

ظفر نے رسالہ رکھ دیا اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"بخار کب سے ہے . . . وے؟"

"دس دن سے جی . . ."

"اور تم رسالہ پڑھ رہے تھے"

"جی صرف تصویریں دیکھ رہا تھا"

"رسالہ مجھے دو ادھر۔"

اس نے چپ چاپ رسالہ پکڑا دیا۔ پہلے وہ کتنی دیر انگشت شہادت کو لب لگا لگا کر ورق الٹتی اور تصویریں دیکھتی رہی۔ پھر اسے کوئی اپنی پسند کی چیز مل گئی۔۔۔ ہتھیلیوں کی پیالی میں ٹھوڑی ٹکا کر پڑھنے میں مگن ہوئی تو پہلے گھنٹہ بھر ٹانگیں ہلاتی پڑھتی رہی۔ پھر ٹانگوں کو کرسی پر اپنے نیچے ایسے لے کر بیٹھ گئی جیسے بطخ تالاب میں تیرتے وقت پاؤں نیچے کر لیتی ہے۔ یوں بطخ بنی جب اس کی ٹانگیں سو گئیں تو وہ کرسی سے اٹھی اور ظفر سے بولی۔

"ذرا ایک تکیہ دینا۔"

ظفر نے تکیہ نکال کر پیش کیا۔

"ذرا ٹانگیں اوپر کو سمیٹ کرو۔"

ظفر نے جنین ([illegible]) کی مانند اپنی ٹھوڑی سے گھٹنے لگا لیے۔ اس کونے والی نے دیوار سے تکیہ کی ٹیک لگائی اور ظفر کی پائنتی نیم لیٹی نیم بیٹھی پڑھنے لگی۔ تھک جاتی تو بڑے سے تو سنے کو ظفر کی جانب کر کے اونگھنے لگتی۔ کچھ دیر بعد اس کا ضمیر ملامت کرتا تو ظفر سے پوچھتی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

اور جواب سنے بغیر پھر پڑھنے میں مشغول ہو جاتی۔

بقول آپا رشتے میں اس کی چچی کی نند تھی بچی اپنے کلیم کے سلسلے میں ان کے

ہاں ٹھہری تھیں اور بتول آپا شہر دیکھنے ساتھ چلی آئی تھی۔

اس دن بتول آپا جو ظفر کے کمرے میں ٹھہری تو اماں کو بے فکری سی ہو گئی۔ دس بیس دن سے وہ بندھی گائے کی طرح گھبرا سی گئی تھیں۔ پھر بتول نے ظفر کو دودھ اور ساگودانہ بھی تین بار پلا دیا تھا۔ اور اس نے بلا سیل و حجت پی لیا تھا۔

اب تو بتول آپا کی ڈیوٹی ظفر پر مستقل ہو گئی۔ وہ یا تو کوئی اردو کا ناول یا رسالہ اپنے ساتھ لاتیں یا پھر ظفر سے مانگ لیتیں۔ اس قدر عیار ادبی شخصیت اور اس قدر ادب نوازی! اس بے جوڑ بے میل رابطے نے ظفر کے لئے بتول آپا کو اور بھی پُر کشش بنا دیا تھا۔ بتول آپا کی گفتگو لٹھ باز گنواروں کی طرح عموماً وے سے شروع ہوتی تھی اور رسالے وہ ایسے ادبی پسند کرتی تھیں کہ بڑے بڑے انٹلیکچوئل کان پکڑیں نہ جانے وہ سارا علم کہاں جاتا تھا۔ کیونکہ اتنے سارے ادب کے باوجود وہ شکل عقل سے بالکل اجڈ اور بانگڑو نظر آتی تھیں۔

ظفر کا خیال تھا کہ شاید سارا ادب اس تونبے سی گنبد میں جا گھستا ہے جو ہر روز صبح سے زیادہ مدقوق ہوتا ہے۔

ظفر ان خاموشی کے گھنٹوں میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ دیوار سے پشت لگائے تونبے کا گنبد اس کی جانب کئے جب وہ پڑھ رہی ہوتیں تو ظفر دعائیں مانگتا کہ یا اللہ میاں میرا بخار کبھی نہ اترے اور یہ شیرنی اسی طرح میری پائنتی پر لیٹی رہے۔ پھر موت آجائے اور ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے لے۔

موت سے تو دونوں کو نہ آئی۔ البتہ ایک دن اچانک ظفر کا بخار اُتر گیا۔ اور اسی روز جنرل کی کچی اپنی پیاری نند کو لے کر لائلپور جا چکی تھیں۔۔۔ یہ دن ظفر کے لیے عجیب سا دن تھا۔ سارا دن نہ اس نے کچھ کھایا نہ کسی سے بولا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔۔۔ ایک ہی بات دل کو رہ رہ کر ستاتی تھی کہ بتول آپا سے اتنا بھی نہ ہوا کہ مجھ سے مل کر ہی چلی جاتیں۔ سارا سارا دن میرے کمرے میں پڑی رہتی تھیں۔ اب اتنی توفیق نہ ہوئی کہ جاتی بار یہ ہی پوچھ لیتیں۔ ”وے کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

بہت سے بعد جب محبت کے جراثیم روز مرہ کی زندگی کے اینٹی بایوٹک نے مار دیئے تو ظفر کو ایک دن امّاں نے کہا۔

”ظفر تجھے بتول یاد ہے؟“

ظفر ان دنوں فسٹ ایئر میں تھا۔ نہ جانے کیوں اسے بریک سی لگی۔

”کونسی بتول، ماں جی؟“

”تمہاری چچی طلعت کی نند۔ لیکن تمہیں کہاں یاد ہوگی۔ تم تو سارا سارا دن بے سدھ پڑے رہتے تھے۔“

ظفر کا دل پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔

”بڑی خدمت کی بے چاری نے تمہاری۔“

”کیا ہوا اسے ماں جی؟“

”بیچاری فوت ہو گئی پرسوں کار کے حادثے میں۔ سال کی بچی چھوڑ گئی ہے پیچھے

"بچی۔۔۔موت۔۔۔اور بتول"
اتنے سارے ادب کی قبر کتنی غیر رومانوی ہے۔ کار کا حادثہ۔۔۔ایک دھاکہ اور بس!

ظفر نے کتنی دیر آپا بتول کی شکل یاد کرنے میں صرف کی۔ لیکن کوئی تصویر تشکیل نہ پائی۔۔۔بس ایک فیروزی کوکا۔۔۔اور ایک گول گنبد ساٹن کے فیروزی غلاف میں لپٹا ہوا۔۔۔آپا بتول کے سارے وجود کا بس یہی کچھ رہ گیا تھا!

غازی نے ظفر کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"دھیان کہاں ہے تمہارا؟ بتیس سوال پوچھ چکے ہیں ہم"

"ہاں۔۔ہاں۔۔پوچھو"

"یہ رشیدہ کی محبت میں اس مقام پہ پہنچ چکا ہے جہاں پہنچ کر ہلیوسی نیشنز ہونے لگتی ہیں"

"شٹ اپ"

غازی نے منہ کو گلاس سے ایک انچ پرے رکھ کر پوچھا۔

"روح پیاری روح! یہ بتا کہ کیا ظفر محبت میں کامیاب ہو گا؟"

گلاس درمیان میں گول گول چکر کاٹنے لگا۔

"اے روح یہ بتا کیا ظفر کی شادی اس بہاولپورن سے ہو گی کہ نہیں۔۔ کہ نہیں؟"

ظفر کی آنکھیں حدتِ چشم سے گرنے کو تھیں جب گلاس نے جلدی جلدی یہ جملہ بنایا۔

"بلکہ اس کے باپ سے۔"

غازی اور افتخار نے بلند قہقہہ لگایا۔ اور یکدم گلاس چھوڑ کر غازی بولا۔

"لے بیٹا! تجھ سے تو روحیں بھی مذاق کرنے لگی ہیں۔ تُو تو ہم ہی سے چڑتا تھا!"

جب ظفر ہوسٹل میں سے نکلا تو بڑی دیر تک یہ قہقہے اس کے ساتھ چلتے رہے جیسے کوئی ضدی فقیر صدائیں لگاتا، دعائیں دیتا ساتھ ساتھ بھاگا آرہا ہو۔

رشیدہ نے اپنی ڈائری بکس کی تہہ میں سے نکالی۔ آنکھ کے کونے سے آنسو کا قطرہ پونچھا اور لکھنے لگی۔

۔ ۷ مئی

میں اماں کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں اور جو نہ لکھوں تو زندہ کیونکر رہوں۔ خالہ فیروزہ اب مجھے یہاں ایک پل نہیں رکھنا چاہتیں۔ ابھی کل جب میں کالج سے لوٹی تو الوزی میز اٹھائے کر گیلری میں آرہی تھی۔ خالہ نے مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا . . . وہ گرمی والا پرپٹ پاؤڈر چھڑک رہی تھیں۔ خالہ کے بازوؤں پر یہ دانے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ اللہ جانے وہ انہیں ختم کرنے کی کیوں سوچتی ہیں؟

"کہاں جا رہا ہے کھانا؟"

"آپا رشو کے کمرے میں۔"

"وہ آپی کھائے گی۔ لے جا باورچی خانے میں"
انوری کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ لکڑی میں ٹھنسی ہوئی میخ کی طرح جم گئی۔
"جی؟"
"لے جا ناں باورچی خانے میں . . . ہم نے کوئی اس کے لئے "نوکر" نہیں رکھے ہوئے . . . لے جا"
جب انوری چلنے لگی تو اس نے اپنے چپڑالا کھ جیسے ہونٹ کھولے اور بولی۔
"رشو آپا . . . آیئے باورچی خانے میں ہی کھانا کھا لیجیے"
اگر میں خالہ کی جگہ ہوتی تو پلٹ کر دیکھتی اور تیورا کر گرتی۔ لیکن خالہ نے مڑ کر دیکھا۔ میرے سلام کا سر کے اثباتی اشارے سے جواب دیا اور پیروں پر پاؤڈر ملنے میں منہمک ہو گئیں۔

۱۱ مئی

اللہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ پورب پچھم سے بادل اکٹھے ہو رہے ہیں۔ جو دن چڑھتا ہے ریگستان کی طرح تپا ہوا۔ جو رات آتی ہے افریقہ کے جنگلوں کی . . . خالہ کا گھر میرے لئے خارپشت کی طرح خاردار ہو رہا ہے . . . کالج میں وہ حضرت ظفر آنکھوں میں لوالہ بنا لینے کے قائل ہیں . . . بہاولپور دور ہے اور موت اس سے بھی دور ہے۔ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟"

۱۲ مئی

سچ لکھوں کہ جھوٹ ؟

لیکن آخر جھوٹ لکھنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے ؟ یہ ڈائری جب مکمل ہو جائے گی ، میرے احمق پن کا جب آخری صفحہ قلمبند ہو چکے گا ، تو میں ایک رات کو موم بتی جلا کر اس کا صفحہ صفحہ جلا دوں گی ۔ جی تو چاہا ہے کہ اس ڈائری کا کاجل بناؤں اور اس کی ایک سلائی ہر روز صبح اپنی آنکھوں میں ڈالوں ۔ کون جانے اس میں سلیمانی ٹوپی کی تاثیر ہو ۔ سب کی نظروں سے چھپاک اوجھل . . .

بول پیاری دوست ! . . میری ڈائری ! تجھ میں سچ رقم کروں کہ جھوٹ ؟ ظفر کو تو نے نہیں دیکھا ؟ . . . تو گھر پر کیسی میں محبوس رہتی ہے ناں ! کسی عرب سردار کی حرم میں مقید پرزاد ! . . تجھ تک تیرا محبوب زنانہ لباس پہن کر ڈولی میں آتا ہے ۔ اور وہی عرب سردار جو تجھ پر ہر روز نئی سوت لاتا ہے ۔ جب تیرے محبوب کو ایک دن تیرے پاس دیکھ لے گا ، تو تیری بے وفائی کی پاداش میں اس کا اور تیرا سر قلم کر دے گا ۔

پیاری ڈائری ! . . . میری دوست ! . . . یہ مرد کی دنیا ہے ۔ یہاں سارے کام مرد کی مرضی سے ہوتے ہیں ۔ مرد نے اپنی سازش میں اللہ کو بھی شامل کر لیا ہے ۔ تمام مذہب مرد اور اللہ کی باہمی رضامندی کا نتیجہ ہیں ۔ ہائے میرے اللہ ! . . . جو کسی نے یہ باتیں پڑھ لیں تو ؟ . .

تو کسی سے کہے گی تو نہیں؟ . . . پیاری ڈائری بول! . . . اس مینا کی طرح بے وفائی تو نہیں کرے گی؟ جو رات بھرات سندر چندراوتی اور چندر کرن کو روشوں پہ ٹہلتے دیکھتی رہی۔ جو اس وقت تو چپ رہی جب چندر کرن نے گلاب کی پتّیاں مار مار کر چندر وتی کے گال لال کر دیئے۔ اور اس وقت بھی خاموش رہی جب چندراوتی نے چندر کرن کے کان کی لو کو بوسہ دے کر کہا۔ "نشچے رکھو چندراوتی ایسی نہیں ہے"

ور بس سے صبح کی پہلی کرن نے اندھیرے کے ماتھے پر لب رکھتے تو مینا نے ؛ جب کے کانوں میں ایک ایک بات اگل دی . . . ایک ایک . . .

بول . . ! کہے گی تو کسی سے نہیں ناں!

مرد اور اللہ میاں چکّی کے دو پاٹ ہیں اور ان میں عورت گیہوں کا دانہ ہے جو اگر پسنے سے انکار کر دے تو اس کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ بیچاری جانتی ہے یہ گھن کیا ہے . . . یہ وہ دکھ ہے جو عورت کے دل میں اس کی برسوں کی غلامی نے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ گھن ہے جو اندر ہی اندر عورت کے دل کو چاٹتا رہتا ہے۔ بالکل جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے آپ کو چاٹ چاٹ کر اپنے گرد ریشم کا گھر بنا لیتا ہے . . . عورت کا گھن اس کے گرد ریشم کا وہ جال بن دیتا ہے کہ اصلی عورت کہیں نظر نہیں آتی۔

ساری سہولتیں مرد کے لئے ہیں۔

ساری اشرف المخلوقاتی مرد کے لئے ہے۔

وہ بے وفا ہے تو یہ اس کی فطرت ہے۔ اس کے رب نے اسے ایسا بنایا ہے'

مرد فطرتی طور پر وہ مرغا ہے جس کے ارد گرد مرغیوں کا سیمنار ہو رہا:
محبت پر۔۔ وفا پر۔۔ ۔ مسئلہ زیر بحث ہے کہ
ہر مرغی کو اسی سے وفا کرنی ہوگی۔ وہ چاہے کسی سے وفا نہ کرے
کیونکہ وہ مرد ہے۔۔۔
اشرف المخلوقات ہے۔
اللہ اللہ! میں کیا بک رہی ہوں۔ نعوذ باللہ کیا کچھ لکھ گئی احمق پن سے۔
بات صرف اتنی ہے پیاری ڈائری!۔۔۔ جھوٹ کہوں کہ سچ؟ بول ناں!
بات صرف اتنی ہے کہ آج ظفر برآمدے میں کھڑا ڈمپل سے باتیں کر رہا تھا۔۔
ڈمپل بغیر آستینوں کا سیک شرٹ پہنے ستون سے کمر لگائے کھڑی تھی۔۔۔۔
ظفر کی نگاہوں میں ستائش تھی۔۔۔
بول ناں! اب کچھ کہتی کیوں نہیں۔۔۔
میری تسلی کے لئے ہی کہہ دے کہ سب جھوٹ ہے۔ یہ ستائش ویسی ہی بے حقیقت ہے۔ جیسے تالاب کے ٹھہرے پانیوں میں بادلوں کا رنگ!
شاید انوری آرہی ہے ادھر۔۔۔"
انوری اندر آئی تو رشو جان نے جلدی سے ڈائری بند کر کے کتابوں تلے رکھ دی۔ انوری گو رشو کی اس گھر میں واحد دوست تھی۔ لیکن ناخنوں کو تراش دینے والی اس احمق دوست سے رشو کو بہت ڈر لگتا تھا۔

"آجاؤں لیلا رشّو آپا؟"

"آجاؤ۔"

انوری اندر آگئی۔ بالکل چپ چاپ۔ نہ پیروں میں وہ اچپلاہٹ نہ آنکھوں میں زندگی نہ ہونٹوں پر ہنسی۔ مردہ مردہ سی آکر میز کے پاس کھڑی ہوگئی۔

"کیا بات ہے انوری؟"

وہ چپ رہی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

انوری نے منہ پرے کرلیا اور ایک پاؤں کے انگوٹھے سے دوسرے پاؤں کے انگوٹھے کو کریدنے لگی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟"

نفی میں کدو سا سر ہلا۔

"پھر؟ ۔ ۔ ۔ ارے تم تو رو رہی ہو۔ بتاؤ ناں کیا بات ہے؟"

اب انوری کے صندل سے گالوں پر مئی کی بارش ہو رہی تھی۔

"یہاں بیٹھ جاؤ ۔ ۔ ۔ بھئی بتاؤ تو ۔ ۔ ۔ کیا بات ہے؟"

بہت دیر رشّو انوری کا کندھا تھپتھپاتی رہی اور انوری روتی رہی۔ جب اس دخانی انجن سے کافی بھاپ نکل گئی۔ تو انوری نے بالآخر کہا۔

"میں جا رہی ہوں جی۔"

"کیا"

"ابا آیا ہے۔"

"کون؟"

"اباجی ۔ ۔ ۔ مجھ سمیر ۔ ۔ ۔ بمبئی سے۔"

"اچھا تو پھر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

انوری پر پھر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ ایک ہی بار بجلی کڑکی اور بادل کھلا بھی تو تند ہواؤں نے وڑاپ سین کی طرح بادلوں کے پٹ میل دیئے۔

"اللہ! انوری کچھ بتاؤ بھی۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ تو کہو۔ آخر اس رونے سے فائدہ؟ حاصل؟ آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ ہائے اللہ! چپ بھی کرو۔ خدا کیلئے!"

انوری کے آنسو دیکھ دیکھ کر رشو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ پھر ایک بار سوچنے لگی کہ یہ ساری دنیا مردوں کی ہے۔ یہاں عورت ڈھور ڈنگر کی طرح ہے۔ ذرا پھن اٹھایا تو پتھر مار کر کچل دی جائے گی۔ ذرا خدمت گذاری سے کام نہ لیا، اطاعت نہ کی، نیک پروین بنکر نہ دکھایا تو مقرّطی ہو جائے گی۔ اسی میں عافیت ہے کہ کولھو کے بیل کی طرح آنکھوں پر اندھیاریاں پہنے اسی ڈگر پر چکّر لگاتے وقت گذر جائے۔ گاڑی والے کو علم نہ ہو کہ بیل اس گردش پیہم سے تھک گیا ہے۔ بیل کے اندر بھاگ جانے کا ہرا نہیں ۔ ۔ ۔ اس میں کھلی فضاؤں میں اکیلے پھرنے کی سکت نہیں ورنہ وہ اس رموں رموں کی زندگی کو کبھی کا چھوڑ جاتا۔

"میں جا رہی ہوں، آپا جی . . ."

رشو نے یکدم پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟"

"وہ جی . . . ."

"ہاں ہاں کہو ناں . . خدا قسم! میں تمہاری دوست ہوں . . ."

"شادی ہے۔"

"شادی؟ . . کس کی؟"

"اس کی . . . . ساجھے کی۔"

ساجھا کون؟ . . ." رشو نے سوال کیا۔

"میری پھوپھی کا لڑکا ہے۔ کھیتوں پر کام کرتا ہے ابے کے ساتھ . ."

رشو جان نے انوری کے بے رونق چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا۔

"وہ . . . وہی ساجھا جو تمہارا منگیتر تھا۔"

انوری چھوٹے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلانے لگی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد رشو نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ شادی ہو رہی ہے اس کی؟"

جو آنسو کمزور سا بند باندھ کر روکے گئے تھے۔ ان میں ترمینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آنکھیں چھل چھلائیں اور گال پھر مئی کی بارش میں بھیگنے لگے۔